

یہ شہر ترقی ہے۔ مولا حلوائی کا بیٹا۔ اپنی اسی گلی میں اس کی دودھ دہی کی دکان ہے۔“

”من میاں اتنی جلدی بھول گئے۔ میں تو تمہارا آڑی تھا۔ یاد نہیں ہے ایک بیر یو ہوا کہ حلوائیوں والی گلی میں تم نے غلیل چلائی۔ غلہ گڑسل کے پوٹے پہ جا کے لگا۔ گڑسل لوٹ پوٹ ہو گئی۔ رگھو حلوائی نے دیکھ لیا۔ رول مچا دی کہ مسلوں نے پنچھی کی اتیا کر دی۔ لو جی میں نے کیا کیا کہ گڑسل کو مٹھی میں دبا، تمہیں بیچنے سے پکڑا اور ٹھٹھیروں والی گلی میں شک گیا۔ حلوائی سگرے ٹاپتے رہ گئے۔“

میں حیران ہو کر سنتا رہا۔ کچھ یاد نہ آیا کہ کب ایسا ہوا تھا۔

”لو جی تمہارے لئے ربڑی لایا ہوں۔“ شہر ترقی نے کوزہ میری طرف بڑھا دیا۔

”ربڑی؟ کیسی ربڑی ہے؟“

”لو اور سنو۔ من میاں پوچھ رہے ہیں کہ کیسی ربڑی۔ ہماری دکان کی ربڑی کی تو اتنی مشہوری ہے کہ باہر سے بھی لوگ اس کی چاٹ میں یاں پہ آوے ہیں۔“

”بھئی لے لو۔“ چھوٹے میاں نے حقہ پیتے پیتے کہا۔

میں نے ربڑی کا کوزہ سنبھالا۔ دو چار باتیں کیں۔ پھر شہر ترقی نے خود ہی رخصت لے لی۔ ”دکان اکیلی ہے۔ پھر آؤں گا۔“

کاغذ سے ڈھکا کوزہ لے کر میں اندر گیا۔ میمونہ سکول سے فراغت پا کر آچکی تھی بلکہ میز پر کھانا بھی چن چکی تھی۔

”کھانا لگ گیا ہے۔“ یہ اطلاع دیتے دیتے نظر کوزے پر گئی۔ ”یہ کیا ہے۔“

”ربڑی شہر ترقی دے گیا ہے۔“

”ربڑی۔“ میمونہ بیتاب ہو گئی جیسے اس کے منہ میں پانی بھرا آیا ہو۔ ”کھانے کے بعد کھائیں گے۔ بہت مزہ آئے گا۔“

کھانا کھاتے کھاتے میں کہنے لگا ”یہ ربڑے وہ دوستی میں لے کر آیا تھا۔ کہتا تھا کہ تمہارا پرانا آڑی ہوں۔ کب کب کے قصے سنا رہا تھا۔ مجھے تو ایک بات بھی یاد نہیں آئی۔“

”اسے یاد ہے۔ تمہیں یاد نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔“ میمونہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں مجھے تو اب کوئی بھی بات یاد نہیں ہے۔“

وہ ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”کوئی بھی بات یاد نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ پھر جیسے میرے لئے اس کا جواز پیش کرنا ضروری تھا۔

”زمانہ بھی تو بہت ہو گیا۔“

”اچھا؟“ جیسے اسے دھچکا لگا ہو۔ چپ ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ”ہاں زمانہ بہت گزر گیا ہے۔“
پھر کھانے کے آخر تک اس نے کوئی بات نہیں کی۔

”میمونہ تم نے ر بڑی نہیں کھائی۔“ بڑی بھابی نے کہا ”تمہیں تو ر بڑی بہت اچھی لگتی ہے۔“
”بڑی بھابی پیٹ بہت بھر گیا۔ پھر کھاؤں گی۔“

مردانے کا صحن گرم موسم کے باوجود کتنا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دینا نے آج یہاں اتنا پانی چھڑکا تھا۔ کہ صحن میں دن کی دھوپ میں جتنی تپش جذب ہوئی تھی سب مر گئی تھی۔ جب میں رات کو یہاں آ کر بستر پہ دراز ہوا تو عجب فرحت کا احساس ہوا۔ ٹھنڈی زمین اس سے اٹھتی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چھوٹے میاں کے حقہ کی نیند آور گڑ گڑاہٹ۔ تاروں بھرا آسمان لگ رہا تھا کہ جلدی ہی سو جاؤں گا اور کل رات والی نیند سے بھی زیادہ گہری نیند سوؤں گا۔ تاروں دیکھتے دیکھتے آنکھیں مند نے لگی تھیں۔ غنودگی کی کیفیت تھی۔ بس اسی غنودگی میں شہرانی کی بات کا خیال آیا۔ اور وہ پورا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ حلوائیوں کی گلی سے گزرتے گزرتے میں نے گڑسلوں کو وہاں کھڑے پیپل پہ شور کرتے دیکھا اور بے ساختہ میرا ہاتھ اپنی غلیل پہ گیا۔ جیب سے غلہ نکال غلیل میں فٹ کر کے جو مارا تو باقی گڑسلیں اڑ گئیں ایک گڑسل پٹ سے زمین پہ گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اور اس کے ساتھ آس پاس کی دکانوں سے ایک شور اٹھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شہرانی نے پھرتی دکھائی۔ پھرتی ہوئی گڑسل کو مٹھی میں دبوچا، میرا ہاتھ پکڑا ”منن میاں بھاگو۔“ کتنی دیر تک ایک گلی سے دوسری گلی میں دوسری گلی سے تیسری گلی میں بس گلی گلی چکر کاٹتے رہے۔ لگتا تھا کہ گلیوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ کیسے نکلے یہ یاد نہیں آیا۔ ایک یاد سے دوسری یاد سے تیسری یاد میں پھر گلیوں کے جال میں تھا یادیں بھی گلیاں ہوتی ہیں۔ نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں گلیوں میں بھکتا پھر رہا تھا۔

ناشتے کی میز پر میں پچھلی صبح کی طرح تازہ دم آ کر بیٹھا۔ مگر ناشتہ کرتے کرتے جب مجھے رات کا خیال آیا تو دم بھر کے لئے تعجب ہوا۔ ”عجیب بات ہے۔“

”کیوں کیا ہوا۔“ میمونہ نے سوال کیا۔

”رات مجھے نیند نہیں آئی۔“

”رات گرمی بھی تو بہت تھی۔“

”گرمی؟ نہیں گرمی تو ایسی نہیں تھی۔ اچھی خاصی خشکی تھی۔“

”تو پھر یہ سمجھ لیجئے کہ اب یہ جگہ آپ کے لئے نئی جگہ ہے۔ نئی جگہ پر نیند مشکل سے آتی ہے۔ ایک دو راتیں تو اس طرح گزرنی ہی چاہئیں۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ کل یہاں مجھے پہلی رات تھی اور میں لیٹتے ہی سو گیا۔ اور جب صبح اٹھا تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ زمانے بعد مجھے پوری نیند آئی ہے۔“

”پھر کیا بات ہوئی۔“

”بس ہوا یہ کہ سونے لگا تھا کہ دھیان اچٹ گیا..... پھر؟“

”شہزادی کی بات کا دھیان آیا۔ گزری بصری باتیں یاد آتی چلی گئیں۔“

”آپ تو کہتے تھے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد ہی نہیں ہے۔ رات رات میں یہ کیا انقلاب آ گیا۔“

”میرے ساتھ یہی ہوتا ہے لگتا ہے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد نہیں ہے۔ مگر کسی کسی وقت یادیں اس طرح امنڈتی ہیں کہ میں ان میں بہتا چلا جاتا ہوں۔“

”اچھی عادت ہے آپ کی۔“ وہ مسکرائی کتنا اطمینان تھا اس کی مسکراہٹ میں۔

”پتہ ہے جب میں یہاں آیا ہوں تو میرے ساتھ کیا ہوا؟“

”کیا؟“

”میں تو اپنے پرانے حساب سے سیدھا دلکشا گیا تھا۔ وہاں کچھ بچا ہی نہیں۔ بس ایک عمارت کا ملبہ پڑا تھا۔ بس ایک دم سے میرا ذہن بھی چٹیل میدان بن گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ دلکشا کو اس کے مکینوں اس کے درختوں پرندوں کے ساتھ تصور میں لاؤں۔ مگر میرا تصور مجھے جواب دے گیا۔ بہنگم طور پر وہاں گھومتا پھرتا رہا۔ پھر جب دھرم شالا کی نئی عمارت کو میں نے دیکھا تو ایک دم سے میں چونکا اور ایک دم سے دھرم شالا کی وہ پرانی عمارت جو ہمیں خالی چہار دیواری نظر آتی تھی۔ میری نظروں میں گھوم گئی۔ اور کس تفصیل کے ساتھ مجھے واقعات یاد آئے۔ میمونہ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ تم نے وہاں کھڑے ہوئے اونچے پتیل پہ لنگور دیکھا تھا اور پھر ہم لنگور دیکھنے کے شوق میں اس طرف چلے تھے۔ رستے میں ہم نے دیکھا کہ ایک سانپ..... یاد آیا۔“ ”نہیں۔“

”نہیں۔ تمہیں یاد نہیں؟ تعجب ہے؟“ مجھے کتنا تعجب ہوا۔



ادھر میمونہ جیسے یادوں میں کھو گئی ہو۔ لیکن جھر جھری لی۔ ”ہاں یاد ہے۔“ پھر چپ ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ”عجب بات ہے۔ لنگور کو میں نے اس کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا۔“

”بس اس یاد نے دلکشا کی ساری یادوں کو میرے اندر زندہ کر دیا۔ کتنا کچھ یاد آ گیا ایک دم سے۔“

”من۔“ میمونہ ابھی تک اسی یاد میں انکی ہوئی تھی۔

”ہاں۔“ میں نے تعجب سے میمونہ کو دیکھا جس نے میری آمد کے بعد پہلی مرتبہ میرے بچپن والا نام لے کر مجھے مخاطب کیا تھا اور کتنی اپنائیت کے لہجہ میں۔

”کتنا لمبا سانپ تھا وہ۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ اگر وہ کہیں ہمیں کاٹ لیتا۔“

”پھر کیا ہوتا، ہم مر جاتے۔“ میں نے سادگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہ ہو ”من۔“ اس کے لہجہ میں کتنی حیرت اور کتنا ڈر سایا ہوا تھا۔

”ہوں۔“

”اس دھرم شالا میں کیا تھا۔ کوئی کبھی اس کے اندر آتا جاتا تو نظر آتا نہیں تھا۔ باہر سے بس پیپل کے درخت دکھائی دیتے تھے۔“

”یا لنگور؟“ میں نے مسکراتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

وہ بھی ہنس پڑی ”وہ بھی بس ایک ہی مرتبہ دکھائی دیا تھا۔“

آج صبح ہی سے گھٹائیں امنڈ رہی تھیں۔ بڑی بھابی نے آسمان پر ایک اڑتی سی نظر ڈالی اور فیصلہ سنا دیا ”تلا کھڑا ہے۔ ٹوٹ کے برے گا۔“ پھر ناشتہ کرتے کرتے بولیں ”آج تو کڑھائی کا دن ہے۔ پتہ نہیں گھر میں بیسن ہے بھی یا نہیں“

”بیسن“ میمونہ بولی۔ ”بیسن تو گھر میں کوئی نہیں ہے۔ جو تھا اس کی میں نے پچھلے جمعہ کو کھنڈویا بنالی تھیں“ ”پھر مگنا پڑے گا“

میمونہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے اپنے سکول چلی گئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں آ بھی گئی۔

”ارے تم تو واپس آ گئیں“ میں اسے واپس آتے دیکھ کر کتنا خوش ہوا تھا۔

”میں نے سوچا کہ آج چھٹی کرو“

”کس خوشی میں؟“

”برکھا کی خوشی میں سوچا کہ تمہیں اپنے ہاتھ کی پھلیاں کھلاتی ہوں اور ہاں اروی کے پتے بھی تو رکھے ہیں۔ کیا یاد کرو گے تم“

”شکریہ“ میں مسکرا دیا۔

اصل میں اب ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہو چلے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آپس میں کتنے گھل مل گئے تھے۔ کہ میں نے اپنے سارے دکھ سکھ پاکستان کے ایام کی ساری کہانی اسے سنا دی اور اس نے بھی کرید کرید کے ایک ایک بات مجھ سے پوچھی شادی کیسے کی۔ بیوی کیسی تھی کیا اسے بیماری ہوئی کیسے دینا سے گئی۔ یہ مجھ سے کسی نے پوچھا بھی نہیں تھا اور میں نے بتایا بھی نہیں تھا اور اگر کوئی پوچھتا بھی تو میں بس واقعہ کی حد تک ہی بتاتا۔ مگر میمونہ نے کتنی اپنائیت کے ساتھ پوچھا کہ میں نے پوری قلبی کیفیت کے ساتھ ایک ایک تفصیل اسے سنائی ”بس ایک لڑکا ہے؟“

”ہاں“

”اسے تم نے امریکہ بھیج دیا۔ اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا“ ”بات یہ ہے میمونہ پاکستان میں بیٹے اپنے باپوں کے ساتھ وہی کر رہے ہیں جو ان کے باپوں نے اپنے باپوں کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے باپوں سے منہ موڑ کر پاکستان کی راہ پکڑی تھی اب ان کے بیٹے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر امریکہ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔“

دھیرے دھیرے کر کے میں نے اپنی ساری ہی رام کہانی اسے سنا ڈالی اور اس نے کتنی درد مندی اور کتنی یکسوئی سے ساری رام کہانی سنی۔ اس کے بعد میں کتنا ہلکا ہو گیا تھا۔ دل پر برسوں سے جو ایک بوجھ سا تھا اور جو وقت کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اتر گیا اب تک مجھے کوئی ایسا ملا ہی نہیں تھا۔ کہ درد مندی سے میری رام کہانی سنتا۔ یہاں آیا تو بڑی بھابھی اور چھوٹے میاں نے بھی سرسری مرحومہ کے متعلق اور بیٹے کے بارے میں پوچھا اور میرے رسمی جواب سے مطمئن ہو گئے پوچھنا اور سننا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو میمونہ کے سلوک سے پتہ چلا۔ تو اب میں ہلکا تھا۔ اور میمونہ کے یہاں بھی اگر میری طرف سے کوئی دل گرفتگی تھی تو وہ غیر محسوس طور پر دور ہو گئی تھی اب ہم ایک دوسرے سے کتنے قریب آ گئے تھے کس انہماک سے وہ اروی کے پتے مین میں لپیٹ لپیٹ کر مل رہی تھی اور کس شوق سے میں کھا رہا تھا کتنے زمانے کے بعد زبان کا ذائقہ واپس آیا تھا۔ خود کھا رہا تھا اور بھابھی کو ساتھ کھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

”ارے بھیا کیا پوچھو ہو نہ ہم وہ رہے نہ برساتیں وہ رہیں۔“ بڑی بھابی کھانے میں رہی تھیں بقی برساتوں کو زیادہ یاد کر رہی تھیں۔

”ساون کے ساتھ کڑھائی چڑھے تھی اور بھادوں تک چڑھی ہی رہوے تھی۔ مینہ بھی کبخت چھا جوں برسے تھا۔ اور پکوان بھی اسی

حساب سے پکے تھا۔ کھانے والے بھی تو کتنے تھے۔ اور روزِ نئی سے نئی فرمائشیں۔“ بڑی بھابی بولتے بولتے چپ ہو گئیں لمبا ٹھنڈا سانس لیا۔ پھر افسردگی لہجہ میں گہری ہو گئی ”وہ زمانے ہی گزر گئے اب تو یہ حال ہے کہ مینہ برستا رہتا ہے اور میں ٹھنڈے چو لہے کو دیکھتی رہتی ہوں۔ پتہ نہیں آج میمونہ کو کہاں سے کڑھائی کا خیال آ گیا“ رکیں پھر بولیں ”برساتیں بھی بخت ماری ویسی نہیں رہیں۔ کیسا جھمکا لگتا تھا کہ پورا پورا ہفتہ گزر جاتا اور سورج کی صورت نظر نہیں آوے تھی۔ ارے ایک دفعہ تو ایسی جھڑی لگی کہ پندرہ واڑہ بیت گیا۔ اور کمبخت مارا مینہ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا۔ کبھی پھوئیاں پھوئیاں، کبھی رم جھم کبھی دھڑا کے کے ساتھ۔ پھو بھی اماں نے کیا کیا کہ بی بی کے نام کی تسبیح درخت میں لٹکا دی۔ اے لودن ڈھلتے ڈھلتے دھنک نکل آئی کہ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پوری کمان۔“

”میمونہ تمہیں یاد ہے“ مجھے بھی ایک برسات یاد آ گئی تھی۔ ”جب ایک دفعہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ہم بھونڈ میں بڑھیاں پکڑتے پھر رہے تھے۔ ایک دم سے گھٹا امنڈ کے آئی اور ایسی برسی کہ بھونڈ دیکھتے دیکھتے تلیا بن گئی۔ کن مشکوں سے بھوپت نے ہمیں وہاں سے نکالا تھا۔“

”اور منن تمہیں یاد ہے“ میمونہ کو بھی ایک برسات یاد آ گئی ”جب دلکشا والے باغ میں جو پرانا نیم تھانا اس پر بجلی گری تھی۔ لگا تھا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ نیم کے پرچے اڑ گئے۔ بھوپت بتاتا تھا کہ اصل میں اس وقت اس نیم پر ناگ نکلا ہوا تھا۔ بجلی اس پر گری تھی۔“

بس پھر ہمیں بیتی برساتیں یاد آتی چلی گئیں۔ بڑی بھابی نے شاید محسوس کیا کہ یہ ہماری ساجھے کی برساتیں ہیں جن میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو فالتو جانا اور آہستہ سے اٹھ کر چلی گئیں۔

ایک برسات، دوسری برسات، تیسری برسات، ایک دم سے ہمیں کتنی برساتیں اکٹھی یاد آ گئی تھیں، جیسے گہری گھٹا امنڈ آئی ہو۔ یادوں کی گھٹا بھی کتنی ظالم گھٹا ہوتی ہے۔ ہم جیسے پھر سے بچے بن گئے ہوں۔ میمونہ اور منن، ایک دوسرے کی انگلی پکڑے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ اس دن کتنی بارش ہوئی تھی آنگن میں ندی امنڈی ہوئی تھی۔ دونوں برآمدے میں بیٹھے بنتے بگڑتے بلبلوں کو گن رہے تھے۔ بوندوں کے بیچ اچانک کوئی بلبلہ ابھرتا اور تیزی سے دوڑتا چلا جاتا ”ارے ارے وہ دیکھو صاحب کا ٹوپ جا رہا ہے“ وہ خوشی سے چلاتی اور اس دم بلبلہ اچانک سے پھٹ جاتا۔ پھر دوسرا ٹوپ پھر تیسرا ٹوپ اور پھر دونوں نے اپنی اپنی ناؤ چھوڑی۔ کاغذ کی دونوں کس تیزی سے بہتی چلی جا رہی تھیں۔ میمونہ نے خوشی سے تالی بجانی شروع کر دی ”آہامیری ناؤ آگے جا رہی ہے۔ منن کھسیانا

ہو چلا تھا کہ میمونہ کی ناؤ بھی زد میں آ گئی۔ آنگن کے بیچ ایک بڑی سی اینٹ پڑی تھی ناؤ اس سے ٹکرا کر رک گئی اور پھر بھیگ کر کھلنے لگی۔ اب تالی بجانے کی من کی باری تھی۔ من کی ناؤ ڈولتی چلی جا رہی تھی۔ میمونہ روہانسی ہو گئی تھی۔ من خوش تھا مگر تھوڑا آگے جا کر من کی ناؤ آموں سے بھرے ناند سے جو بیچ آنگن میں رکھا تھا ٹکرائی اور فوراً ہی اس کے جوڑ جوڑ کھل گئے۔ آگے پیچھے دونوں ناویں ڈوب گئیں مگر من نے تو فوراً ہی توجہ ہٹانے کا اہتمام کر لیا۔ اپنی چکی نکال گھمانی شروع کر دی کس تیزی سے چکی اس کی انگلیوں کے بیچ سے نکل کر گھر گھر کرتی ہوئی اور ڈور کی حد تک پہنچ کر اسی تیزی سے مٹھی میں آ جاتی۔ میمونہ دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔ پھر اس نے جواب میں اپنی لال پیلی پھر کئی نکالی اور گھمانی شروع کر دی من جو بھی کرتا اس کے جواب میں میمونہ کو بھی کچھ کرنا ہوتا تھا۔ وہ دن جب من بازار سے اچھا سا ٹیسو خرید کر لایا۔ میمونہ مچل گئی میں بھی ٹیسولوں گی۔ پھوپھی اماں نے ڈانٹا ”باولی ہوئی ہے۔ ٹیسو لڑکیوں کے لئے تھوڑا ہی ہووے ہے۔ لڑکیاں تو جھانجی لے کے نکلیں ہیں۔“

تو میمونہ کے لئے جھانجی آگئی مٹی کی لٹیا۔ اسکے گردا گرد آنکھ کی شکل کے سوراخ سوراخوں پر سبز پتنگیا کاغذ منڈھا ہوا۔ اندر دیوالا ٹمھاتا ہوا لوجی جھانجی میں پیسے پڑنے شروع ہو گئے۔ ”واہ بیٹا مفت کے پیسے بٹور رہی ہو جھانجی کا گیت تو گا کے سناؤ۔“

جھانجی کا گیت اسے یاد ہوتا تو سناتی۔ من نے تو ٹیسو کا گیت فوراً ہی سنا ڈالا۔

میرا	ٹیسو	یہیں	اڑا
کھانے	کو	مانگے	بڑا
دی	بڑے	میں	پنی
دھر	دے	مائی	اٹھنی

”پھوپھی اماں یہ ٹیسو جھانجی کا کیا بکھیڑا تھا۔“ شاید بڑی بھابی نے پوچھا تھا۔ پھوپھی اماں فوراً ہی شروع ہو گئیں۔ ”ارے وہ تاس پینا گندھاری کا جتا پاندوؤں کی چلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ کنھیا جی نے جھانجی بنا کے اس کا بیاہ اس سے کر دیا کہ اس کا دھیان بٹ جاوے۔“

”ہائے اللہ۔“

”اے بی یہ سب ہندوانی باتیں ہیں۔ اللہ جانے اس میں کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ ہے عذاب ثواب ہندوؤں کی گردن پہ۔ ہم نے تو جو سنا وہ سنا دیا۔ یہ بھی کہوے ہیں کہ جھانجی اصل میں ٹیسو کی جوڑ تھی۔“

”پھوپھی اماں سچ کہو۔“

”اے بی میں کیا جانوں۔ ہندوؤں کی کہی سناؤں ہوں۔ ویسے ایک بات تو ہے اس کلموے ٹیسو کو کون اپنی بیٹی دیتا۔ کنھیا جی نے اتنا احسان تو اس پر کیا کہ ایک گڑیا سی کنیا بنا کے اس کے حوالے کر دی کہ لومیاں گڈے گڑیا کو سنگھواؤ۔“

میمونہ نے فوراً ہی الاپنا شروع کر دیا۔

گاجر کی پیندی گلخیر دکا پھول

لومیاں گڈے تمہیں گڑیا قبول

”بارش تیز ہو گئی۔“

”کیا۔“ میں چونک پڑا۔ میمونہ نے تیز ہوتی بارش کو دیکھ کر ایک اڑتا سا فقرہ کہا۔ اور ادھر یا دوں کی بدلیاں تتر بتر ہو گئیں۔ بارش واقعی تیز ہو گئی تھی۔ پہلے سیدھی برس رہی تھی۔ پھر ترچھی برسے لگی۔ اور اب دھواں دھار والے مرحلہ سے گزر کر اس کی رفتار میں ایک توازن بھی آ چلا تھا۔ تیزی کم، شور بھی کم۔ مگر تو اتر کچھ اس قسم کا تھا کہ جیسے ایک زمانے سے یہ مینہ برس رہا ہے اور ایک زمانے تک برستا رہے گا۔ کتنی دیر تک کس انہماک سے ہم دونوں اس ترچھے مینہ کو تکتے رہے کتنی دیر تک یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ مینہ کا رخ بدل کر ہماری طرف ہو گیا ہے۔

بس وہ ایک دم سے چونکی ”بوچھا آ رہی ہے۔“ اپنا مونڈھا پیچھے سرکاتے ہوئے مجھے ہدایت کی ”من‘ تم بھیگ رہے ہو۔ مونڈھا

اند سر کالو۔“

”نہیں۔“

”نہیں؟“ میمونہ نے مجھے تعجب سے دیکھا ”بوچھا تیز ہے۔ سارے کپڑے تر بتر ہو جائیں گے۔“

”پیشک ہو جائیں۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ پھر وضاحت کی میمونہ تمہیں یاد نہیں ہے۔ مجھے بارش میں بھیگنے کا نہانے کا کتنا

شوق تھا۔“

”تو تمہارا بچپنا ابھی گیا نہیں ہے؟“

اس فقرے نے مجھے افسردہ کر دیا۔ ”کاش اس بچپنے کو میں بچا کر رکھ سکتا۔“ یہ کہتے کہتے میری نظریں سامنے صحن میں کھڑے بارش میں بھیگتے نیم پر گئیں اور جی کی جی رہ گئیں۔ جیسے یہاں کے آنے کے بعد پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا ہوں۔ کتنے سکون سے کھڑا



بھیک رہا تھا۔ جیسے یہی سکون اس سے پھوٹ کر پوری فضا میں سرایت کر گیا ہو برستی ہوئی بارش میں بھی ورنہ جب وہ شروع ہوئی تھی تو اس میں ایک اضطراب کی کیفیت تھی اور اسی حساب سے پوری فضا میں ایک کھلبلی مچ گئی تھی۔ مگر اب بارش میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ ایک ہی رفتار کے ساتھ ہوئے چلی جا رہی تھی۔ پیڑ، پودے، دیواریں، منڈیریں سب بوندوں میں شرابور، جیسے تشنگی مٹ چکی ہو اور اب سب آسودہ ہوں۔ اور نیم پر تو ایک سپردگی کا عالم تھا۔ بالکل وہی عالم۔ زمانے پہلے کا نقشہ ایک دم سے آنکھوں میں پھر گیا۔ جب آندھی اٹھتی تھی تو پورا نیم ہل جاتا تھا۔ ٹہنیوں کے سچ کھلبلی مچ جاتی تھی۔ گرج، چمک، پھر دھڑاکے سے مینہ برسنا شروع ہو جاتا۔ آندھی تھمتی چلی جاتی۔ لگاتار برستی بوندوں میں شرابور ہو کر کر ٹہنیاں بھی شانت ہوتی چلی جاتیں۔ اور پھر نیم پر ایک سپردگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ نیم پر پھر پوری فضا پر۔

”میمونہ، نیم کو دیکھ رہی ہو۔“

”ہاں دیکھ تو رہی ہوں۔ پھر؟“

”میں نے تو اسے ابھی تک دیکھا ہی نہیں تھا..... ویسا کا ویسا ہی ہے۔“ اور یہ کہتے کہتے میں حیرانی میں ڈوب گیا۔ اس زمانے میں بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ یہاں دو ہی تو بزرگ تھے۔ دادامیاں اور نیم۔ جیسے دونوں ہم عمر ہوں۔ مگر دادامیاں کی کمر جھکتی چلی گئی۔ بال پہلے ہی برف ہو چکے تھے۔ پھر ایک دن آنکھیں مند گئیں۔ اس روز یہ نیم کتنا مغموم نظر آ رہا تھا۔ اکیلا رہ گیا تھا۔ مگر پھر اسی طرح شاداں اور فرحاں۔ ہم دونوں تو بس اس کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے تھے، جیسے اسی کا حصہ ہوں، جیسے میمونہ اس کے تنے سے نکلی ہو، دھیرے دھیرے اور میں جیسے اس کی ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی۔ مگ میں نے سوچا، باقی ٹہنیاں تو ابھی تک ہری بھری ہیں۔ بالکل پہلے کی طرح۔ اداس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ پھر مجھے حیرانی نے آ لیا۔ بالکل ویسا کا ویسا ہی ہے۔ کمال ہے۔ ہم بدل جاتے ہیں، درخت نہیں بدلتے۔ ہمارا نیم ویسا کا ویسا ہی ہے۔ ہاں اب..... اور اس کے ساتھ کتنے نقشے کب کب کے میرے تصور میں گھوم گئے۔ جب اس کے موٹے گدے میں جھولا پڑتا تھا۔ میمونہ کتنا لمبا جھوٹا لیتی تھی کہ اس کا سر بکھرتے بالوں کے ساتھ اونچی ٹہنیوں کو جا چھوتا۔ مگر میمونہ بس جھولا ہی جھول سکتی تھی، لمبے جھونے لے سکتی تھی۔ نیم پر چڑھ نہیں سکتی تھی۔ خیر زیادہ اونچا تو میں بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔ مگر اس کے نیچے والے گدے تک تو پہنچ ہی سکتا تھا۔ کتنا مزہ آتا تھا اس گدے پر بیٹھنے میں، جیسے ہم زمین سے بلند ہو گئے اور نیم کا حصہ بن گئے ہیں۔ ٹہنیوں میں سے ایک ٹہنی۔ اس وقت میمونہ کتنی تلملاتی تھی۔ مگر میری اس میں کیا خطا تھی۔ میں اسے روکتا تھوڑا ہی تھا۔ بلکہ میں تو اسے سہارا دے کر چڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے اچھا لگتا۔ عجب سی لذت کا احساس ہوتا تھا۔ محض چھو لینے سے اور

اس کوشش میں تو..... کتنے ایسے موقعے یکا یک دھیان میں ابھر آئے۔ اور کسی کسی دفعہ تو وہ میرے سہارا دیتے دیتے ایسا پھلستی تھی کہ..... دھیان میں لاتے لاتے میں خود ہی جھینپ گیا۔ پتہ نہیں میں نے سوچا، میمونہ کو بھی یہ سب کچھ یاد ہے یا نہیں۔ یاد ہونا تو چاہئے۔

”میمونہ۔“ آخر میں نے ہمت کی ”یہ نیم بالکل بھی تو نہیں بدلا..... میرا مطلب ہے کہ جب ہم.....“ میں کچھ کہتے کہتے جھجک گیا۔ پتہ نہیں میمونہ کو کچھ یاد آیا بھی یا نہیں۔ ہوں کر کے چپ ہو گئی۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا ”میمونہ تمہیں بھی تو ایک شوق تھا۔“

”کونسا شوق۔“

”جھولا جھولنے اور ساوئی گانے کا شوق۔“

”ہاں۔“ میمونہ اب کے واقعی افسردہ ہو گئی۔ لیکن بس ہاں کہہ کر چپ ہو گئی۔

”کڑھائی تو چڑھی، جھولا نہیں پڑا برسات آدھی منائی گئی۔“

”یہ لڑکیوں کا شوق ہوتا ہے۔ تمہیں اس گھر میں کوئی لڑکی نظر آتی ہے۔“

”تمارے شوق کو کیا ہوا؟“

”تم میری عمر کو دیکھ رہے ہو؟“

”دیکھ رہا ہوں، کیا ہوا تمہاری عمر کو؟“

وہ ٹپٹا کر چپ ہو گئی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر چلی گئی۔ مینہ اسی ایک رفتار سے برسے جارہا تھا اسی اپنے ترچھے انداز میں۔ میں واقعی ترتر ہو چکا تھا۔ مگر مجھے اچھا لگ رہا تھا سامنے صحن میں ندی امنڈی ہوئی تھی۔ بوندیں ایسے گر رہی تھیں جیسے ابلتے تیل میں پھلکیاں۔ کوئی کوئی بوند اس طرح پڑتی کہ پھول کر ٹوپ کی شکل بن جاتی۔ ٹوپ تیرتا چلا جاتا، پھر پھٹ جاتا۔ ایک ٹوپ، دوسرا ٹوپ، تیسرا ٹوپ، بنتے بگڑتے پانی کے ٹوپ۔ بارش ہوئے چلے جا رہی تھی۔ اندر جمی ہوئی گرد سب دھل دھلا گئی تھی۔ دھل دھلا کر ایک نیا آ پا اندر سے نکل آیا تھا۔ یا شاید پرانا آ پا نکھر کر ابھر آیا تھا۔ بس میں اپنے آپ کو اجلا اجلا محسوس کر رہا تھا جیسے اندر سے دھل گیا ہوں۔

وہ واپس آئی ”من، من، تم بالکل بھیگ چکے ہو۔ باتھ روم میں، میں نے پانچامہ کمر بند ڈال کر اور کرتا ناگ دیا ہے۔ جا کر نہاؤ اور

لباس بدلو۔“

میں بردباری سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف ہولیا۔ نہادھو کر اجلا کرتا پانچجامہ پہن کر باہر نکلا تو دیکھا کہ بارش رک چکی ہے اور میمونہ مونڈھے پہ بیٹھی پت نالے سے گرتے موتی جیسے پانی کو یکسوئی سے نکلے جا رہی ہے۔ میں مونڈھا کھسکا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ پت نالے سے پانی پہلے بہت تیز گر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ تیزی قدرے کم ہوئی اور دھار بھی موٹی سے پتلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور یہ دھار جب کھرنبے میں گرتی تھی تو لگتا تھا کہ پگھلی ہوئی چاندی بکھر رہی ہے۔

سامنے والی منڈیر پر اچانک ایک گزسل اتری۔ ایک پھریری لی پروں کو پھڑپھڑایا اور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دوسری گزسل اڑ کر آئی اور اترتے ہی اس نے بھی زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ دونوں نے مل کر تھوڑی دیر شور مچایا اور ایک ایک کی پھر سے اڑ گئیں۔

”میمونہ تم نے سنا انہوں نے آپس میں کیا کہا اور کیوں اڑ گئیں۔“

”تم نے سنا ہوگا۔ تمہیں معلوم ہوگا۔“

”پہلے جو گزسل آئی تھی وہ اصل میں نہ تھا۔ اس نے پکار کر کہا کہ جانم بارش رک گئی ہے۔ باہر نکلو۔ ذرا سیر کو چلتے ہیں۔ دوسری یہ آواز سن کر پردے سے برآمد ہوئی۔ خوش ہو کر بولی کہ ارے واہ واہ بہت اچھا موسم ہے۔ سیر میں بہت مزہ آئے گا اور دونوں سیر پر نکل گئے۔“

میمونہ کھلکھلا کر ہنسی۔

مگر اب میری نظریں منڈیر سے پھسل کر پوری دیوار کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ کاہی لگی دیوار دھل کر کتنی چمک اٹھی تھی۔

”میمونہ یہ سامنے والی دیوار کو دیکھ رہی ہو کتنی کالی ہو گئی ہے۔ اور بیچ بیچ میں سبز کاہی جھلک رہی ہے۔“

”ہاں واقعی۔“ اور وہ ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ پہلی مرتبہ اس دیوار کو دیکھ رہی ہے۔

”اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس حویلی نے کتنی برساتیں دیکھی ہیں۔ برساتیں ہم سے پہلے بھی آئی ہوں گی جو ہمارے بڑوں نے دیکھی ہوں گی۔ مگر ہم نے بھی ان برسوں میں جب میں ابھی یہیں تھا کتنی برساتیں دیکھ لیں۔ لگتا ہے کہ پورا زمانہ ہم نے جیا ہے برساتوں کی ایک پوری صدی..... ہاں پوری صدی..... اگلی برساتیں آنے والے دیکھیں گے۔“

”آنے والے؟“ میمونہ نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔ لہجہ میں ایک ہلکی تلخی آ گئی ”کون آنے والے دیکھیں گے۔ سب تو چلے

گئے۔“

میں چپ ہی تو ہو گیا، جیسے مجرم جرم کا احساس دلانے پر چپ ہو جائے۔ کتنی دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ میمونہ سے آنکھیں ملانے کی اور بات کرنے کی اب مجھ میں ہمت کہاں رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں پھر پڑنے لگی تھیں۔ پھر ہلکی سے تیز ہوتی گئیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ اپنی پرانی حویلی اپنی آخری برسات دیکھ رہی ہے۔

بڑی بھابی کا سروطہ اور زبان دونوں ہی اس دن کچھ زیادہ رواں تھے۔ کب کب کے قصے کہاں کہاں کی باتیں، جیسے حافظہ کے سارے دریچے کھل گئے ہوں۔ ویسے ان چند دنوں میں وہ اتنا کچھ سنا چکی تھیں کہ میرے جانے کے بعد سے اب تک خاندان جن کے مراحل سے گزرا تھا وہ سب اپنی تفصیلات کے ساتھ میری معلومات کا حصہ بن چکے تھے۔ خیر اپنے جانے کے بعد کے حالات سے تو میں بے خبر تھا ہی مگر اب پتہ چلا کہ اس سے پہلے کی خاندان کی تاریخ سے بھی میں اتنا باخبر نہیں تھا جتنا اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔ بس میں خبر اور بے خبری کے دورا ہے پر تھا کہ یہاں سے سے چلا گیا۔ خاندان کی تاریخ کبھی اپنے کسی فرد پر اکٹھی منکشف نہیں ہوتی۔ بے شعوری سے شعور کی منزل کی طرف اور شعور کی منزل سے ذہنی پختگی کی طرف سفر کرتے ہوئے بڑے بوڑھوں کی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں اور غیر محسوس طور پر اور بے ارادہ خاندان کی تاریخ شعور میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہے۔ پتہ چلا کہ کتنی باتیں تھیں جن کا مجھے کوئی پتہ نہیں تھا۔ مثلاً جب سے میں نے ہوش سنبھالا پھوپھی اماں گھر میں براجمان دیکھا۔ کیا ان کا رعب داب تھا۔ تائی اماں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ آخرد و صاحب حیثیت بھائیوں کی بہن تھیں۔ ایک کو چھوٹی بہن کی حیثیت سے عزیز تھیں۔ دوسرے پر بڑی بہن کی حیثیت سے رعب رکھتی تھیں۔ دلکشا کے چھوٹے بڑے ان کا لوہا مانتے تھے۔ باورچی خانے میں انہیں کا حکم چلتا تھا۔ مگر نہ میں نے کبھی سوچا نہ ویسے پتہ چلا کہ جب پھوپھا زندہ و سلامت ہیں اور اپنے قصبہ میں ایک حیثیت کے مالک ہیں تو پھر پھوپھی اماں دلکشا میں کیوں براجمی ہوئی ہیں۔ لڑائی بھی نہیں تھی۔ لڑائی ہوتی تو برسات کے برسات ان کی طرف سے آم کی پیٹیاں کیوں آتیں اور جاڑوں میں گنوں کی پھاندیاں اور گنے کے رس کے گھڑے کیوں آیا کرتے۔ ہاں خود کبھی نہیں آئے تھے۔ میں نے انہیں بس ایک دفعہ دیکھا تھا جب وہ پیارے میاں کی شادی کے موقع پر اس نائی کو لے کر آئے تھے جو ان کی دانست میں قورمے اور بریانی کے پکانے میں اتنی مہارت رکھتا تھا کہ دلی کے باورچیوں سے ٹکر لے سکتا تھا۔ مگر شادی کے پورے عرصے میں وہ جب نظر آئے باورچی خانے ہی میں نظر آئے۔ مونڈھے پہ بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پکانے والوں سے دنیا جہان کی باتیں کر رہے ہیں۔ اندر سے جب نائن

کسی کام سے یہاں آتی تو اس سے تھوڑی چہل کرتے۔ اس کے چلے جانے کے بعد پھر باورچیوں سے مخاطب ”ہاں کیا ذکر ہو رہا تھا میاں بلاتی۔“

”قادر۔ اچھا پٹھا نکلا تھا۔ جانی پہلوان سے اس کی کشتی یاد ہے نا۔“

”ہاں جی، خوب یاد ہے۔“

”ہندو کس زور شور سے اسے میرٹھ سے لے کے آئے تھے۔ ویسے وہ پہلوان تھا زوردار۔ جب اکھاڑے میں اتر کے چکر لگاتا اور مٹی ملتا کہ مست ہاتھی آ گیا ہے۔ قادر اس کے سامنے بھنگا لگ رہا تھا۔ مگر خالم نے کیا دھوپ پی پڑا مارا ہے کہ کچم کچم جانی چپ پڑا تھا۔“

”پر آ غامیاں تمہارے قادر کو اس ڈھڈو بالو نے چاٹ لیا۔“

”کیا بتائیں میاں بلاتی۔ ہم نے قادر کو بہت سمجھایا تھا کہ کبخت عورت کے قریب مت جائیو۔ مارا جائے گا۔ مگر اس کی گدی میں بات آئی نہیں۔“

”آ غامیاں ایک بیر میرے جی میں آئی تھی کہ بالو کی چونیا پکڑ کے ایک جھانپڑ لگاؤں کہ ڈھڈو چھٹا لای کرنا ہے تو کوئی اور گھر دیکھ۔ ہمارے پہلوان کو بخش دے۔ پر جی کچھ سوچ کے میں چپ ہو گیا۔“ ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر جاری ”ہمارے اکھاڑے کی بہار قادر تک تھی۔ اب خاک اڑے ہے۔ اب سالا جولد آوے ہے وہ چار دن زور کرے ہے اور اپنے آپ کو گا ماں سمجھنے لگے ہے۔ پھر ہیرو بننے کے خناس میں بمبئی بھاگ جاوے ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو میاں بلاتی۔ وہ نمک حرام شدن۔ میں نے گھی کے کنستر کے کنستر اس کے اندر انڈیل دیے۔ کیا جوان نکلا تھا۔ کیا اس کی چوڑی چھاتی تھی۔ مگر ہوا کیا کہیں کبخت نے بمبئی کی بلی، والی فلم دیکھ لی۔ بس سلو چنپا مر مٹا۔ کہنے لگا بمبئی جاؤں گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ ذات کی وہ یہودن ہے تجھے گھول کے پی جائے گی۔ نہیں مانا۔ میں نے کہا، جا، مر۔ چلا گیا۔ پھر کیا ہوا۔ سلو چنپا کی تو ڈیوڑھی تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ بمبئی کے بازاروں میں آوارہ پھرتا رہا۔ جب واپس آیا تو میاں بلاتی سچ جانن بالکل چوہا بن چکا تھا۔“

حقہ کا لمبا گھونٹ اور پھر جاری۔ ”میاں بلاتی، عورت بڑی بلا ہوتی ہے۔ جو اس کے چکر میں پڑ گیا سمجھ لو کہ کام سیکھا۔“

یہ تھے پھوپھا آغا کہ کبھی شادی بیاہ کی تقریب سے یا کسی مرنے جینے کے موقع پر وارد ہوئے۔ مگر اس طرح کہ خانساواؤں اور باورچیوں کے بیچ بیٹھ کر اپنی حکمت کے موتی بکھیرتے اور رخصت ہو جاتے۔ پھوپھا جانی ان کے الٹ تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی، بر میں

حیدر آبادی تراش کی شیروانی، علی گڑھ کٹ پانجامہ پیروں میں بودالا گرگابی پپ، کیا وقار تھا۔ سچ مچ پھوپھا نظر آتے تھے۔ حیدر آباد میں ملازمت کرتے تھے۔ آتے تھے تو بڑے وقار کے ساتھ بیٹھک میں معززین کے بیچ کر گفتگو کرتے۔ آصف جانی دربار سے منسلک امرا کے قصے قصے ان کا موضوع ہوتے۔ مقامی معززین کتنے مرعوب ہوتے۔ اور کتنی حیرت سے وہ واقعات سنتے۔ ہاں چھوٹی پھوپھو بیچاری دبی دبی رہتیں۔ پھوپھی اماں کی شخصیت کے نیچے وہ اتنی دب گئی تھیں کہ ان کی موجودگی میں بات کرنے کی مجال ان میں کم کم پیدا ہوتی تھی۔ ایک چھوٹی پھوپھو یہ کیا موقوف تھا دوسرے بھی ان کے سامنے بات کرنے کی کتنی مجال رکھتے تھے۔ خود پھوپھا آغا بھی ان کے سامنے آ کر بلی بن جاتے تھے۔ باورچی خانے میں بیٹھ کر خانسا ماؤں کے سامنے کتنا رعب گانٹھتے تھے۔ زنان خانے میں آتے جاتے تو اپنا سارا رعب داب پیچھے چھوڑ آتے۔ ویسے وہ زنان خانے میں آتے کہاں تھے۔ آتے بھی تو لئے دیئے سے رہتے۔ اور پھوپھی اماں سے بات کرتے تو میں نے انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ لگتا تھا کہ دونوں کے بیچ میلوں کا فاصلہ ہے۔

یہ تو اب بڑی بھابی کی باتوں سے پتہ چلا کہ قصہ اصل میں کیا تھا۔ مشتری بائی فساد کی جڑ تھی۔ پھوپھا آغا کی راتیں تو مشتری بائی کے حجرے میں گزرتی تھیں۔ پھوپھی اماں کب تک برداشت کرتیں۔ ایک دن تاؤ کھایا اور میکے چلی آئیں۔ پھر کبھی واپس نہیں گئیں۔ بھائیوں کے بھرے پرے گھر سے جو انہیں شغف تھا اس نے انہیں کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ادھر پھوپھا آغا کا رویہ یہ تھا کہ تم روٹھے ہم چھوٹے۔ تجر دے طرف یہ ڈھارس دلانے کے لئے کافی تھی کہ ان کی شادی بے ثمر نہیں رہی۔

میرے پاپا جانی پر بھی شاید پھوپھی اماں کا پرچھاواں پڑ گیا تھا کہ ازدواجی زندگی سے انہیں بھی نفور رہا۔ جب تک جے پردیس میں رہے۔ برس میں ایک پھیرا لگاتے تھے اور کتنا کچھ ساتھ لاتے تھے کہ گھر بھر جاتا تھا۔ اپنے پرائیوں سے مل جلے اور واپس۔ اللہ نے ایک اولاد دینے دی تھی اس پر قانع تھے۔ ایک دفعہ آئے تو بھانجی کو پیاری پیاری باتیں کرتے دیکھا، سمجھ گئے اور بیٹے کے لئے مانگ لیا۔ شاید اب کے اسی لئے آئے تھے۔ اس کے بعد خود نہیں آئے جنازہ آیا۔ اندر باہر پٹس پڑ گئی۔ کون تھا جس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔ مگر جس پر یہ موت بھاری پڑی وہ میری امی جان تھیں۔ جدائی میں پہلے ہی گھٹتی رہتی تھیں۔ اب دیکھتے دیکھتے سوکھ کر کاٹا ہو گئیں اور سال کے اندر اندر سدھا رہ گئیں۔ مگر اس ڈھائی گھڑی کی موت کا راز اب آ کر کھلا۔ ”چچا جانی جب آخری دفعہ آئے ہیں تو کتنے خوش تھے۔ جب پھوپھی اماں نے میمونہ کے لئے حامی بھر لی تو نہال ہو گئے سمجھ رہے تھے کہ بہن نے دونوں جہان کی دولت انہیں بخش دی۔ مگر وہ دکھیا رانی خود بھی اجڑ گئی۔ انہیں بھی لے بیٹھی۔ کسی کبخت نے راجہ کے کان بھر دیئے۔ راجہ کچے کانوں کا تھا۔ کہاں تو چچا جانی پر اتنا اعتبار کرتا تھا کہ ساری ریاست کا کاروبار ان پر چھوڑ رکھا تھا کہاں یہ بے اعتباری۔ بس چچا جانی نے ہیرے کی

کئی چاٹ کر اپنے آپ کو ختم کر لیا۔“

ماضی کے کتنے اندھیروں اجالوں میں گھما پھرا کر بڑی بھابی اصل موضوع پر آئیں۔ ”بھیا اگر تم ہماری مانو تو ایک بات کہیں۔“

”جی؟“ میری سمجھ میں نہ آیا کہ بڑی بھابی کیا کہنا چاہتی ہیں۔

”بھیا ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ جو کہیں گے تمہارے بھلے کی کہیں گے۔ باہر کر کے تم نے دیکھ لیا۔ میں پوچھتی ہوں تم نے کتنا سکھ پایا۔ پھر وہی اکیلے کے اکیلے۔ اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ تم میمونہ سے شادی کر لو۔“

”میں شپٹا گیا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔“ اب؟“

”اے بھیا میں نے ایسی کوئی غلط بات کہہ دی۔ تمہارے بھلے کی ہی کہی ہے۔ اور چچا جان نے جو سوچا تھا وہ بھی تمہارے بھلے ہی کے لئے سوچا تھا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جب پھوپھی اماں نے ہاں کر دی تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اور انصاف کی بات ہے پھوپھی اماں بھی تمہیں دیکھ کے جیتی تھیں۔ جب تم چلے گئے ہو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا انہیں تو بالکل چپ لگ گئی۔ یہ غم انہیں لے بیٹھا۔ میمونہ بیچاری بچی اکیلی رہ گئی۔ اور میاں جان کے بعد تو بالکل ہی اکیلی ہو گئی۔ اب کون ہے۔ اس دینا میں اس کا۔ بیچاری بچی۔“ چپ ہوئیں اور پھر چھوٹے میاں سے مخاطب ہوئیں کہ خاموشی سے آ کر بیٹھ گئے تھے اور حقہ پئے جا رہے تھے۔ ”ارے تم بھی تو کچھ بولو۔ تمہاری بھی تو آخر کچھ رائے ہوگی۔“

”ہماری بہن بہت اچھی ہے۔ بہت نیک ہے۔“ چھوٹے میاں نے مختصر کہا۔

”ارے نیک نہ ہوتی تو اس طرح اپنی عمر گزار دیتی۔ اور رشتوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔ کئی رشتے آئے ایک سے ایک اچھا مگر غریب کا ایسا دل ٹوٹ گیا کہ پھر اس نے کسی رشتے پہ ہاں نہیں کی۔“

”بہت شریف ہے۔ ہمارے جو بیٹی کی کمی تھی اس نے پورا کر دیا۔ اب وہ ہماری بہن بھی ہے اور بیٹی بھی۔ دو کمیاں پوری کی ہیں۔“

”پھر کیا خیال ہے تمہارا۔“ بڑی بھابی نے سیدھا سوال کیا۔ میں چپ رہا۔ جھجکا پھر آہستہ سے بولا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”اے بھیا جانے بھی دو ایسی کوئی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی کل کی تو بات ہے کہ تم میاں سے ہنستے کھیلتے گئے تھے۔ پتہ نہیں واں جا کے تم پہ کیا آفت پڑی کہ بال کھڑی کر لئے۔ اور ہم نے تو لوگوں کو بڑھا پے میں بیاہر چاتے دیکھا ہے۔“ پھر چھوٹے میاں سے مخاطب ہوئیں۔ ”اجی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس عمر میں شادیاں ہوتی نہیں ہیں۔ اور میمونہ تو اب بھی ماشاء اللہ ویسی ہی ہے جیسی تب تھی۔ بس

ذرا غموں سے جھٹک گئی ہے۔“

چھوٹے میاں نے حقے کا لمبا کش لیا پھر بولے ”ٹھیک ہے۔ جو ادا اپنے حالات کو دیکھ لیں، سوچ سمجھ لیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ابھی جواب دیں۔“

”ہاں ہاں بھیا سوچ لو۔ کل کلاں کو یہ مت کہنا کہ چھوٹے میاں اور بڑی بھابی نے پھنسوا دیا۔“

دل ہی دل میں چھوٹے میاں کا میں کتنا شکر گزار ہوا۔ بڑی بھابی تو گلے پہ چھری رکھ کے ہاں کرانے پہ تلی تھیں۔

وہ رات کس خرابی سے گزری۔ کبھی اس کروٹ کبھی اس کروٹ۔ جیسے میرے دو حصے ہو گئے ہوں۔ ایک کہہتا تھا، ہاں۔ دوسرا کہتا تھا، نہیں۔ کس کی مانوں، کس کی نہ مانوں۔ کتنے زمانے پہلے کی خواہش جو کہیں دب دبا گئی تھی ایک دم سے ابھر آئی تھی۔ میرے اندر اس کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر اندر ہی سے مخالفت کی آواز بھی اٹھ رہی تھی۔ فیصلہ کن کردار یادوں نے ادا کیا۔ کہ جو بھی یاد آتی ابھر آنے والی خواہش کو تقویت پہنچاتی اور مخالف میں اٹھنے والی آواز کا زور کم ہوتا محسوس ہوتا۔

صبح ہوتے ہوتے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے مجھے چین آ گیا ہو۔ شاید میری اطلاع کے بغیر اندر کوئی فیصلہ ہو گیا تھا۔ مگر مجھے اس فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے یا شاید اس کا اعلان کرتے ہوئے ایک ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا کہ آج کی بات کل پر ٹل جائے تو اچھا ہو۔ مگر کسی طرح۔ بڑی بھابی نے ایک رات کی مہلت تو دے دی تھی۔ مزید مہلت ملتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے آخر خیرل بھائی سے بھی تو ملنا ہے۔ بس میں نے ناشتے کی میز پر پہنچنے سے پہلے ہی اعلان کر ڈالا۔ ”میں اس وقت میرٹھ جا رہا ہوں۔“

”اچھا؟“ بڑی بھابی بولیں۔

”خیرل بھائی سے ملنا ہے۔“

”خیرل بھائی۔“ چھوٹے میاں تھوڑا چکرائے ”وہ سکی؟ اس سے ملو گے؟“

”خیرل بھائی کو آپ سکی کہتے ہیں۔ ہماری پوری پارٹی انہیں جینکس مانتی تھی۔“

”جینکس“ چھوٹے میاں نے حقارت بھرے لہجے سے کہا۔ ”جینکس ایسے ہوتے ہیں، گھدا آدمی، زندگی میں کچھ بھی تو کر کے نہیں

دیا۔ بہر حال تمہیں روکتا کون ہے ضرور ملو جا کر۔“

میں حیران کہ یا اللہ یہ اپنی خیرل بھائی ہیں۔ یہ تو وہ ہیں ہی نہیں۔ وہ چہکتے مہکتے اپنی نرالی دج والے خیرل بھائی کہاں چلے گئے۔

شاید چھوٹے میاں نے انہیں صحیح سنی کا خطاب دیا تھا مگر وہ کب سے ایسے ہوئے۔ ویسے اس زمانے میں بھی سنک تو ان پر سوار ہو جایا

کرتی تھی۔ ہمارے جاتے جاتے ان پر کیا سنک سوار ہوئی تھی کہ بندھا بستر ہی کھول دیا۔ ہماری پارٹی نے تو انہیں کی کمک پر پاکستان کے لئے بستر باندھا تھا۔ خیال تھا کہ وہ تو تحریک میں بہت پیش پیش رہے ہیں۔ سب قائدین تک ان کی رسائی ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے راوی ہمارے لئے چین رکھتا ہے۔ اور واقعی وہ ساتھ ہوتے تو میں جھگی نشین کیوں بنتا۔ مگر سنت وقت پہ انہوں نے ہمیں نوٹس دیا ”یار تم لوگ جاؤ۔ میں نہیں جاتا۔“

ہم بہت شپٹائے ”آخر کیوں؟“

”بس میں یہیں رہوں گا۔“

”مگر..... ہم.....“

”تم لوگ جاؤ۔ کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ آخر کسی کو یہاں بھی تو رہنا چاہئے۔“

بس جو دماغ میں ساگنی مجال ہے کہ اس سے ادھر ادھر ہو جائیں۔ اور اب زمانے بعد میں آیا تھا تو حیران و ششدر کہ خیرل بھائی بدل کر کیا سے کیا بن گئے ہیں۔ مگر ارد گرد بھی تو بالکل بدل گیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ کوئلہ محلہ کی اس گلی کو چھوڑ کر جہاں خیرل بھائی کا گھر تھا۔ چمک مہک تو اس گلی کی بھی چلی گئی تھی اور اس گھر کی بھی جو پہلے بہت بھرا پرانظر آتا تھا اور اب اتنا ویران کہ خیرل بھائی کو چھوڑ کر بس ایک بلی نظر آ رہی تھی۔ گلی بھی ویران ہی تھی۔ مگر نقشہ وہی تھا ذرا جو تبدیلی آئی ہو۔ مطلب یہ کہ نقشہ وہی مگر اس طرح آباد نہیں۔ گلی سے باہر مجھے سارے شہر کا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سارے وہ نشانات جن سے میں اس شہر کو پہچانتا تھا جیسے مٹ گئے ہوں۔ ان کی جگہ نئے نشانات نے لے لی تھی۔ عمارتیں، کڑ جیسے سب بدل گئے ہوں۔ اور بھیڑ الٹی تو ہے۔ کتنی مرتبہ چلتے چلتے احساس ہوا کہ یہ وہ شہر نہیں ہے۔ میں بھول کر کسی اور شہر میں نکل آیا ہوں۔ شاید سب شہروں کے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ اس طرح سے بدلتے ہیں کہ کوئی سخت جان نشان ہی باقی رہ جاتا ہے باقی سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اچھا ہوا کہ ہمارا دیا س پور کوئی بڑا شہر نہ ہوا کہ پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ وہ تو یہ کہنے کہ دلکشا کے ملبہ نے میری آنکھیں کھول دیں ورنہ مجھے تو سب کچھ ویسا ہی نظر آ رہا تھا۔

”خیرل بھائی آپ کا میرٹھ تو بہت بدل گیا ہے۔“ یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ خیرل بھائی آپ بدل گئے ہیں۔

”اچھا؟“ واقعی؟“

جب بار بار انہوں نے یہ کلمہ کہا تو میں نے بال آخر کہا ”مگر خیرل بھائی آپ کی حیرانی مجھے حیران کر رہی ہے۔ آپ تو اس شہر میں

رہتے ہیں۔ آپ کو احساس نہیں ہوا کہ تب سے اب تک یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے۔“

خیرل بھائی بولے ”میاں جب تک ہم میرٹھ کالج میں رہے تب تک تو روز انہیں بازاروں سے گزرتے تھے ہمیں تو کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔“

”خیرال بھائی یہ تو آپ شروع کے سالوں کی بات کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تو آپ نے اس کالج کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ جب میں نے وہاں سنا تھا تو مجھے تعجب ہوا کہ اچھی بھلی لیکچراری پہ آپ نے کیوں لات ماردی۔“

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے ”میاں جو اذبات یہ ہے کہ جب ہم میرٹھ کالج میں پڑھتے تھے تب یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ مگر لیکچرار بننے کے بعد عجب سا احساس ہونے لگا کہ ارے یہاں تو ہندو بہت ہیں۔ بس ہم اکھڑ گئے۔“

”مگر اس کے بعد علی گڑھ میں تو آپ کا دل لگنا چاہئے تھا۔“

”ہاں چاہئے تو یہی تھا۔“ خیرل بھائی سوچتے ہوئے بولے ”ویسے علی گڑھ میں بھی تو آخر ہم پڑھتے ہیں۔ لیکن عجب بات ہے کہ ان دنوں بالکل پتہ نہیں چلا۔ اب ہم وہاں گئے تو احساس ہوا کہ یہاں تو مسلمان بہت ہیں۔ جدھر نظر اٹھاؤ ادھر مسلمان۔ میاں جو ادھیچ جاننا ہمیں خفقان ہونے لگا۔ بس ہم وہاں سے اکھڑ لئے۔“

”اور پھر میرٹھ میں آ کر بیٹھ گئے۔“ میرے منہ سے یونہی نکل گیا۔

”ہاں میرٹھ میں اپنے ٹھئے پر۔ مگر اب تم کہہ رہے ہو کہ میرٹھ بدل گیا ہے۔ تو پھر تو اچھا ہی ہوا کہ اپنے ٹھئے پر بیٹھ کر پھر ہم گھر سے نکلے ہی نہیں۔“ یہ کہتے کہتے انہوں نے رحیم الدین بابا کو آتے دیکھا ”اے لورجیم الدین بابا کو تمہارے آنے کا پتہ چل گیا۔ کس پھرتی سے چائے بنا کر لائے ہیں۔“

رحیم الدین بابا کو میں نے مشکل سے پہچانا۔ پہلے بھی کون سے جوان تھے۔ اب تو بالکل ہی کمر جھک گئی تھی۔ ”رحیم الدین بابا اچھے تو ہو۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“

چائے رکھ کر جانے لگے تو خیرل بھائی نے انہیں ٹوکا ”رحیم الدین بابا تم نے شاید انہیں پہچانا نہیں۔ یہ جواد میاں ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔“

رحیم الدین ٹھٹھکے۔ مجھے غور سے دیکھا۔ خوش ہوئے دعائیں دیں۔ واپس جانے لگے۔ پھر پلٹے قریب آ کر بولے۔ ”میاں“

میرا کرمو بھی پاکستان میں ہے۔ کبھی وہ بھی ملا تمہیں۔“

”نہیں۔ کس شہر میں ہے وہ۔“

”ارے اس کمبخت نے کبھی خط لکھا ہوتا تو مجھے پتہ چلتا کہ کس شہر میں ہے۔ بس وہیں کہیں پاکستان میں ہے۔ میاں میرے بڑھاپے پر رحم کر کے ذریعوں اسے ڈھونڈھیو۔ مل جاوے تو چار جوتے میری طرف سے ماریو اور کہو کہ ارے بد بخت ایک دفعہ تو

بوڑھے باپ کو صورت دکھائیا۔ اور نہیں تو خیریت کی چٹھی ہی لکھ دے۔“

”اچھا بابا، مل گیا تو کہوں گا۔“

جب وہ چلا گیا تو خیرل بھائی بنے اور کہنے لگے ”رحیم الدین بابا مجھ سے کہتا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں ایک اشتہار نکلوا دو کہ کرمو جہاں ہے اسے معلوم ہو کہ اس کا باپ پریشان ہے اور اسکی خیریت کا طالب ہے۔ میں نے کہا کہ رحیم الدین بابا اگر یہ اشتہار نکلوایا تو پھر تو اس مضمون کے اور بھی بہت سے اشتہار نکلوانے پڑیں گے۔ اس پر کہنے لگا کہ ویزا دلوا دو تو میں ہی پاکستان کا ایک پھیرا لگائیوں۔ بیٹے کی صورت بھی دیکھ لوں گا اور پاکستان کو بھی دیکھ لوں گا۔“ رکے۔ پھر کہنے لگے ”عجیب بات ہے۔ یہاں جو بھی ہے ایک دفعہ ضرور اس کے دماغ میں یہ کیڑا بلبلاتا ہے کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگایا جائے۔“

”مگر خیرل بھائی۔“ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوچھ ہی لیا ”آپ کا کبھی جی نہیں چاہا کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگایا جائے۔“

”میرا؟“ انہوں نے مجھ گھور کے دیکھا ”نہیں۔“

”آخر خیرل بھائی آپ پاکستان سے بے تعلق تو نہیں تھے۔ تحریک میں تو آپ بہت پیش پیش تھے۔“

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے ”ہاں ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت وہ کوئی ملک نہیں تھا ایک خواب تھا۔“ پھر آہستہ سے بولے ”خواب جب تک خواب رہے اس میں بہت سحر ہوتا ہے..... مگر“ عین اسی وقت ان کی بلی جسے انہوں نے میری خاطر رخصت کر دیا تھا آن کودی۔ خیرل بھائی نے اسے پچکارا۔ پھر وہ اسے پچکارنے میں ایسے محو ہوئے کہ اپنی ادھوری بات کو پورا کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

خیرل بھائی سے ملاقات تشنہ رہی۔ پھر بھی اس نے مجھ پر عجب اثر کیا۔ اندر جو ایک تذبذب تھا وہ رفع ہو چکا تھا۔ جب میں واپس پھرا ہوں تو کتنا مطمئن تھا۔ اور اندر سے کتنا خوش۔ رات دیر سے پہنچا تھا۔ بڑی بھابی سے مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی۔ مگر اب میں اس مڈھ بھیڑ کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ صبح کتنا خوش خوش میں ناشتہ کی میز پر جا کر بیٹھا تھا۔ مگر مجھے جلدی ہی محسوس ہوا کہ میمونہ چپ چپ



ہے۔ میں نے قیاس کیا کہ میرے پیچھے کوئی بات ہوئی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اڑتی سی نظر اس پر ڈالی۔ ایک دو دفعہ بات کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہ ہوں ہاں کر کے چپ ہو گئی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ بیکل ہے، جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

”میمونہ کیا بات ہے۔ آج تم چپ چپ ہو۔“

”کچھ نہیں۔“

”پھر بے چین کیوں ہو؟“ اب میں کس اعتماد سے بول رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔“

رک کر بولی ”ہاں۔ کہنا نہیں پوچھنا ہے۔“

”کیا؟“

”بس اتنا پوچھنا تھا۔“ اور اچانک اس کے لہجہ میں تیزی آ گئی۔ ”تم جا کب رہے ہو۔“

میں شٹا گیا۔ کتنا غیر متوقع سوال تھا۔ میں کیا توقع کر رہا تھا اور اس نے پوچھا کیا۔ ”تمہیں میرا یہاں رہنا شاید.....“ اس

پہلے کہ میرا فقرہ مکمل ہوا اس نے آواز دی ”بڑی بھابی ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اب آ جائیے نا۔“

”آ رہی ہوں۔“ بڑی بھابی کی آواز برآمد سے آئی۔ اور ساتھ ہی ان کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فقرہ جہاں ٹوٹا تھا

وہیں میں نے چھوڑ دیا۔ مگر میں بڑی بھابی کے آنے سے پہلے کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔

”جلدی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

بڑی بھابی نے میری بات سن لی تھی۔ ”اے ہے کس بات کی جلدی ہے۔ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔“ پھر انہوں نے متجسس نظروں

سے پہلے مجھے اور پھر میمونہ کو دیکھا۔ پھر چپ سی ہو گئیں۔ خاموشی سے ناشتہ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”سکول کو دیر ہو رہی ہے۔“

”دیر؟ دیر کہاں سے ہو گئی۔“ بڑی بھابی بولیں۔

”ہاں آج جلدی پہنچنا ہے۔“ اور یہ جاوہ جا۔

بس اسی آن چھوٹے میاں بھی آن وارد ہوئے۔ مگر اس عرصے میں میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔

”سوچتا ہوں کہ لگے ہاتھوں اور رنگ آباد کا بھی ایک پھیر لگاؤں۔“

”ہاں ہاں تو ضرور جانا۔ چھوٹی پھو پھو تمہیں دیکھنے کے لئے بہت بے چین ہیں۔“

”ہاں وہاں جانا تو چاہئے۔“ بڑی بھابی بولیں ”مگر اتنی جلدی کیا ہے۔ چلے جانا۔“